داؤد رہبر کی غزل گوئی

عائشہ عظیم

ABSTRACT:

Doctor Daud Rahbar unfolds social trends, communal aspirations and culinary tastes in his characteristic poetic wit. Although he performed a considerable drill of lyrical poetry, it could not surpass his excellence in prose. However, in the most modern tradition of Urdu ghazal, his Urdu verse is such an addition which is a source of adherence to his past. In his poetry we find an artist propagating freedom of expression . His poetry is not the traditional poetry but a source of connection with his past, culture and heritage. He is not contented with whatever is there, he is always on the look out for the things out of sight , especially the people who are millions of miles away.

غزل ایک ایسی صنف ہے جس کا مخصوص پیکر ہے۔ اردو شعر و ادب میں اس کا درجہ ام الاسالیب کا ہے۔(۱) اس کی تعمیر لہجے، زبان و بیان، داخلیت، لطافت، تغزل، رمزیت و ایمائیت کے بغیر ناممکن ہے۔ اردو غزل کے سفر پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ زمانے میں جو تغیرات اور تبدیلیاں آئیں ان سے اردو غزل بھی متاثر ہوئی اور عہد بہ عہد بدلتی تصویروں کا عکس غزل میں نظر آتا رہا۔ میر تقی میرؔ کی شاعری دِلی کی بربادی کا نوحہ ہے تو غالبؔ کی غزل غدر کی تباہ کاریوں کا آئینہ ہے۔اقبالؔ کی غزل نے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کیا جس کے لیے اسے مسلمانوں کے شان دار ماضی کو یاد کرنا پڑا۔فیضؔ کی غزل میں بھی تغیّر کی واضح جھلک موجود ہے۔غرض ہر دور کا شاعر اپنے خارجی عوامل سے متاثر ہوتے ہوئے اپنی داخلی کیفیات کو غزل کے سانچے میں ڈھالتا رہا۔غزل ایک دل فریب صنفِ سخن ہے اور وارداتِ قلبی کا پُرکشش انداز میں اظہار کرتی ہے۔ اردو غزل نے ہر موضوع سے مطابقت پیدا کی ہے۔ ہر نیا موضوع نئے خیال کو جنم دیتا ہے۔شاعر اس خیال کے اظہار کے لیے علائم و رموز کا انتخاب کرتا

ہے، جس سے غزل کو حیاتِ نو ملتی ہے اور یہی حالات و واقعات اور افکار غزل کا مخصوص لہجہ اور مزاج بناتے ہیں۔

ڈاکٹر داؤد رہبر منفرد نثر نگار اور باشعور لکھاری ہیں۔ غزل کے میدان میں بھی ان کا اپنا لہجہ اور انداز ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ شعر گوئی عطیہ خداوندی ہے لیکن شاعر کا مزاج اور حالات و واقعات اس کی غزل کا لہجہ بنانے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مزاج لہجہ کا تعیّن کرتا ہے اور مزاج ہمارے شب و روز کے تجربات اور مشاہدات سے بنتا ہے۔ داؤد کی غزل بھی ان کے مزاج اور لہجہ کی عکاس ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں کو جاننے اور ان کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے سرگرداں رہے۔ ذاتی زندگی اور اپنے عہد کے مسائل، انسانی رشتوں کی شکست و ریخت اور انتشار نے ایک حزنیہ کیفیت کو جنم دیا جو ان کے اشعار میں کبھی شوریدہ سری اور کبھی آشفتہ مزاجی کے روپ میں نظر آتی ہے۔

؎ محشر میں بھی کہاں ہے اتنی
شوریدگی اپنے ہاں ہے اتنی

(کلیات، ص:۲۶۷)

؎ اک نے ہنسایا اک نے رلایا اور اک نے خاموش کیا
سامنے اپنے آیا ہے کیسا کیسا انسان ، اللہ

(کلیات، ص:۱۱۵)

؎ مجھ کو کولہو میں بھی جوتا اور مزدوری نہ دی
اور فغاں کرنے کی مہلت بھی کبھی پوری نہ دی

(کلیات، ص:۶۳۴)

ان اشعار میں ذاتی کرب اور سماجی کرب کی جھلک موجود ہے جو شاعر کو یاسیت کے کنارے تو لے جاتی ہے مگر قنوطیت کا شکار نہیں ہونے دیتی۔ ان کی آتشِ غم بھڑک کر شعلہ جوالہ نہیں بنتی، بل کہ اس کی دھیمی دھیمی آنچ شاعر کو سلگاتی رہتی ہے۔ ان کی شاعری زندگی کی حقیقتوں اور تجربات کی شاعری ہے۔ اردو غزل کی وہ تعریف جو کلاسیکی غزل کے حوالے سے کی جاتی ہے، داؤد کی غزل اگرچہ اس تعریف پر پورا نہیں اترتی مگر باوجود اس کے جدید اردو غزل میں ان کا اپنا کردار ہے۔ ان کی غزل دراصل ان کی آپ بیتی ہے۔ مشفق خواجہ داؤد صاحب کے نام ایک مکتوب مرقومہ ۲۲ اگست ۱۹۹۰ میں لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔۔لیکن آپ کی غزلوں سے شعروں کو الگ کر کے دیکھنا ظلم ہے کیوں کہ آپ کی غزل اول تا آخر ایک موڈ یا مزاج کی ہوتی ہے، سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ کی غزل روایتی نہیں ہے۔ آپ نے غزل کا صرف جسم روایت سے لیا ہے، روح خود پھونکی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی غزل آپ ہی سے مخصوص ہو کر رہ گئی ، اس میں آپ کے مطالعے کی جھلکیوں کے ساتھ ساتھ آپ کے مشاہدات و تجربات کے مختلف پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں بل کہ ایسا محسوس ہوتا

ہے کہ آپ غزل نہیں لکھتے، آپ بیتی لکھتے ہیں، تقریباً ہر غزل میں ایک لطیف طنز کی لہر نظر آتی ہے اور اسی طنز سے شعر کی معنویت اجاگر ہوتی ہے۔'' (۲)

جراتِ اظہار، سچ سے محبت، اولوالعزمی اور بلند ہمتی ان کے اشعار میں جا بجا نظر آتی ہے۔ ان کی ڈکشن دوسروں سے مختلف ہے۔ وہ الفاظ کو احساس، جذبے، حقیقت اور شعور کو اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔ ان کی اکثر غزلوں میں فارسی الفاظ و تراکیب کا غلبہ نظر آتا ہے۔ انھوں نے انوکھی تراکیب کو اپنی غزل میں سمو کر اردو غزل کے ذخیرہ الفاظ (vocabulary) میں اضافے کا سبب بنا دیا۔

جدید اور تیز رفتار زمانے نے اردو غزل کو موضوعاتی وسعت عطا کی ہے۔ اردو غزل نے خود کو محض حسن و عشق، ہجر و وصال اور اخلاق و تصوف کے دائرے تک محدود نہیں رکھا بلکہ ہر موضوع کو نہایت سلیقے سے برتا۔ غزل کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے اور شاعر خود بھی نہیں جانتا کہ غزل کے اگلے شعر میں اس کا موضوع کیا ہوگا۔ داؤد رہبر کی غزل کا موضوعاتی مطالعہ کریں تو اس میں جہانِ معنی نظر آتا ہے۔ چھوڑی ہوئی سرزمین کا تصور، بچھڑے ہوئے احباب، لوگوں کے میل جول اور رویّے کے اثرات، بیگانگی کا احساس، ترک زدہ زمینوں کا المیہ، دیارِ غیر کے مسائل، تنہائی کا کرب، موسیقی کے اسرار و رموز، خدا کا تصور، تبدیلی مذہب اور نجی سانحاتِ زندگی، یہ سب مل کر ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ وہ اپنے دل کی وحشت کم کرنے کے لیے رنگین تمناؤں اور موہوم خوابوں کی تمنا کو دل میں جگاتے ہیں۔ انھوں نے ایک ایسے معاشرے سے تعلق استوار کر لیا، جو ان کی اقدار سے میل نہیں کھاتا تھا۔ وہ ہجر اور اخلاقی قدروں سے بیگانہ معاشرے کے مقابل کھڑے ہو کر اپنی زمین کو یاد کرتے نظر آتے ہیں۔

ے پچھّم والے سوچ رہے ہیں اب کیا کارِ خیر کریں
تفریحیں پُورب میں بہت تھیں اب کیا ان کے بغیر کریں

(کلیات، ص: ۲۲۶)

ے قسمت نے ہم کو پیاروں سے دُور کر دیا ہے
ہر رات کو ہماری دیجور کر دیا ہے

(کلیات، ص: ۲۲۳)

داؤد کا زندگی کے بارے میں تصور بہت واضح ہے۔ انھیں ہر طرح کے حالات و واقعات سے واسطہ پڑا۔ زندگی ان کے سامنے ایک جبرِ مسلسل کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور ہمہ وقت تلخی ایام کی کہانی دہراتی رہتی ہے۔ وہ ہمیشہ ناآسودہ رہے۔ داؤد سمجھتے ہیں کہ انسان پابہ زنجیر ہے اور قضا و قدر نے اس کے مقدر کا تعین کر دیا ہے۔ وہ اپنی تقدیر سے بچ نہیں سکتا۔ اس کا اپنے اعمال و افعال پر کوئی اختیار نہیں ہے۔

ے باغِ جنت سے نکالی گئی نسلِ آدم
تھی فرشتوں کی یہ سازش کہ یہ آباد نہ ہو

(کلیات،ص:۳۲۹)

ے اور بھی تھے کئی گنہ ممکن
جو مقدر تھے میں وہ کر آیا

(کلیات،ص: ۲۳۰)

داؤد خدا شناسی کے عمل سے گزرتے ہوئے خدا سے سنبھلا ہوا شکوہ بھی کرتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں مجبور محض ہے۔ دنیا میں آنے سے پہلے اس کا مقدر لکھ دیا جاتا ہے تو پھر مرنے کے بعد وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار کیوں کہلاتا ہے۔

ے سامنے میرے تھا پہلے تو مقدر رکھا
اور اب ہے میرے اعمال کا دفتر رکھا

(کلیات،ص:۳۸۱)

ے ہم نہیں سمجھے یہ قصہ کوئی سمجھاؤ ہمیں
کیوں وبال اجداد کے اعمال کا ہے آل پر

(باقیات،ص:۱۰۱)

وہ اس بات پر پریشان بھی ہوتے ہیں کہ ان کے نامہ اعمال میں کوئی نیک عمل نہیں ہے تو روزِ محشر ان کی نجات کیوں کر ممکن ہو گی۔

ے راہبر کی ہووے گی اے دوستو کیسے نجات
یہ تو اب اس کے لیے کوئی کماتا ہی نہیں

(کلیات،ص:۴۷۳)

لیکن وہ قنوطیت کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کا اس بات پر یقین ہے کہ خدا اگر قہار و جبار ہے تو رحیم و کریم بھی ہے۔ وہ اپنے بندوں کی خطاؤں کو بخشنے والا ہے۔ وہ اللہ تعالٰی کی رحمت سے ہرگز بھی مایوس نہیں ہوتے۔

ے مایوس ہو نہ رہبر اللہ کے کرم سے
صحراؤں کو بھی اس نے معمور کر دیا ہے

(کلیات، ص ۲۳۷)

ے ہے تجھ کو معلوم تیرے بندے، ہوئے طاعت گزار کیوں کر
جمال پر تیرے مر کے بھی ہیں، جلال سے تیرے ڈر کے بھی ہیں

(کلیات، ص: ۲۱۸)

ایک سچے مسلمان کی طرح شاعر کا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ روزِ محشر جب اعمال کے دفتر کھولے جائیں گے تو اس وقت پیغمبر آخرالزماں ﷺ کی شفاعت سے سب مسلمانوں کی بخشش ہو جائے گی۔

ے شفاعت سے گنہگارو وہاں سب فیصلے ہوں گے
ضرورت دیکھ لینا واں نہیں ہوگی ترازو کی (۳)

جمال پرستی کی بات کریں تو داؤد کے کلام میں جمال اور خوب صورتی کا احساس تو ہے لیکن وہ رچا ہوا نہیں ہے۔ ان کی غزل میں لطف اندوزی کی کیفیت موجود نہیں ہے۔ ان کا محبوب گوشت پوست کا زندہ و متحرک انسان ہے۔ داؤد اس کے سراپا، اس کے خدوخال، اس کے گیسو، عارض، آنکھوں اور ناز و ادا کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن ان کے محبوب کا حسن ماورائی نہیں ہے، بل کہ اس کے بیان میں انھوں نے اعتدال اور حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔

ے ہے اک بلا قامت تری اور اک بلا تیرا خرام
ہے بس خدا ہی جانتا کیا کیا ہیں محشر تیرے ہاں

(باقیات، ص: ۴۲)

ے ہے بنانے والے نے شوق سے یہ خرامِ ناز دیا اسے
نہ سکھاؤ رقص کے گُر اسے، اسے اپنی چال پہ چھوڑ دو (۴)

داؤد کا محبوب چوں کہ جدید زمانے کا انسان ہے اس لیے اس نے فیشن کے جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی زلفِ دراز اور خم دار کو تراش کر ایک نیا انداز دے دیا ہے اور شاعر کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ یہ وہی محبوب ہے جس کی زلفیں اردو غزل میں باقاعدہ ایک مضمون کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ شاعر اس بات پر پریشان ہے کہ اب وہ غزل میں کس طرح زلفِ دراز کا مضمون باندھے۔

ے قینچی چلی ہے اس پہ بھی صد حیف راہبر
مضمون ختم ہو گئے زلفِ دراز کے

(کلیات، ص: ۲۱۸)

غزل ہمیشہ سے داخلی جذبات و احساسات اور خارجی حالات و واقعات کے اظہار کا بہترین ذریعہ رہی ہے۔ داؤد کی غزل نہ صرف ان کے قلبی جذبات و احساسات کی عکاس ہے، بل کہ وہ ان خارجی عناصر کا ذکر بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ہاں اس درجے کی داخلیت اور خارجیت کا امتزاج ہے۔ ان کے دل پر جو کچھ بیتی، انھوں نے

اسے غزل کے سانچے میں ڈھال دیا۔

؎ کس شان سے روشن ہیں تمنا کے دیے
آندھی میں منائی دوالی ہم نے

(کلیات،ص:۶۲۰)

داوَد کی غزل ان کے عشق کی داستان نہیں ہے بل کہ زندگی کی حقیقتوں اور تجربوں کا قصہ ہے۔ ان حقیقتوں اور تجربوں میں طربیہ عنصر کم اور المیہ عنصر زیادہ ہے۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق کا شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے حادثات، مشکلات اور تنہائیوں کو دل کا روگ نہیں بنایا، بل کہ وہ رنگین تمناؤں اور موہوم خوابوں کے دیے جلاتے نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں عشق کی وہ واردات نہیں ہے جس کا اظہار دیگر شعرا کے ہاں نظر آتا ہے۔ داوَد نے غزل میں عشق کے جذبات کا اظہار مختلف انداز میں کیا ہے۔ وہ محبوب سے بھرپور محبت تو کرتے ہیں لیکن ان کی شاعری محبوب کے حسن کے گرد والہانہ رقص نہیں کرتی۔ وہ چاہتے ہیں کہ وصل کی گھڑیاں ٹھہر ٹھہر کر گزریں لیکن کبھی کبھی محبوب کے نخروں سے نالاں بھی ہو جاتے ہیں۔

؎ ان کے آتے ہی ہوئی رفتار کیوں گھڑیوں کی تیز
وصل کی شب وقت ہم کو ٹھہرا ٹھہرا چاہیے

(کلیات،ص:۹۶)

؎ کہنے لگے وہ پیار نہ تم کو کریں گے ہم
میں نے بھی چڑ کے کہہ دیا، اچھا، نہ کیجیے

(کلیات،ص:۳۳۶)

عشقیہ مضامین کی طرح خمریات کا ذکر بھی ہمیشہ سے غزل کا اہم جُزو رہا ہے۔ اردو غزل میں شراب اور متعلقاتِ شراب کے تذکرے تقریباً ہر شاعر کے یہاں موجود ہیں۔ اردو شاعری میں اس کی تقلید فارسی شاعری سے کی گئی۔ ساقی، جام، صراحی، مے کدہ، تر دامن وغیرہ کے علائم عاریتاً اردو غزل میں استعمال کیے گئے۔ اس کا تذکرہ زیادہ تر شرابِ معرفت کی اصطلاح میں کیا گیا۔ اس سلسلے میں حاؔلی لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔۔۔اس کے سوا ان لوگوں (صوفیا) کی غزل میں اکثر شراب و ساقی و جام وصراحی اور ان کے لوازمات اور خلافِ شرع الفاظ مجاز اور استعارہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ یہ لوگ (یا تو اس اس خیال سے کہ دوست کا راز اغیار پر ظاہر نہ ہو یا اس نظر سے کہ لوگوں کا حُسنِ ظن جو رہزنِ طریقت ہے اس سے محفوظ رہیں۔ یا اس لیے کہ عشق و محبت کی بھڑاس آزادانہ اور اندازِ گفتگو میں بہ نسبت سنجیدہ اور مودب گفتگو خوب نکلتی ہے اور یا اس غرض سے کہ حریفوں کو چھیڑ چھیڑ کر اور زیادہ بھڑکائیں اور ان کی رجز و ملامت جو بے گناہ ملزموں کو تحسین و آفرین سے زیادہ خوش گوار ہوتی ہے، مزے لے کر سنیں) روحانی کیفیات کو شراب و شاہد کے پیرایہ میں

بیان کرتے تھے۔'' (۵)

داؤد کی غزل میں ہمیں جا بجا مے اور متعلقاتِ مے کا ذکر ملتا ہے۔ وہ اپنی عمر کے کسی حصے میں زاہد خشک نہ بن سکے۔ ان کے یہاں بادہ و ساغر کے معاملات عرفانِ ذات کی طلب کا استعارہ بن کر ابھرتے ہیں۔ غالبؔ نے اسی مضمون کو اس انداز میں باندھا ہے:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

(غالبؔ)

تشبیہ و استعارہ کے استعمال سے اظہار میں سہولت اور خیال میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر ممتاز الحق غزل کا فن کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب ادا کرنے کا فن ہے۔ نہ صرف یہ کہ غزل کے اشعار میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی بل کہ تفصیل سے غزل کا مزاج مجروح ہوتا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ غزل کی تنگ دامانی ہی میں اس کا حسن مُضمر ہے۔(۶) برجستہ اور برمحل تشبیہات و استعارات کلام میں آمد کا اثر پیدا کرتے ہیں۔ غزل کا استعاراتی رجحان ایک استعاراتی نظام کو جنم دیتا ہے اس کے بغیر غزل کا کوئی تصور نہیں۔ اسی نظام کی بدولت غزل میں رعایتِ لفظی، اختصار، رمزیت، اشاریت، فصاحت و بلاغت اور پہلو داری پیدا ہوتی ہے۔ داؤد نے تشبیہ و استعارہ کا استعمال عمدگی سے کیا ہے۔ انھوں نے اپنی غزل میں جو استعارے استعمال کیے، وہ گہری معنویت لیے ہوئے ہیں ان کی غزل میں بادہ و ساغر کے معاملات عرفانِ ذات کا استعارہ بن گئے۔ وہ معاشرتی بنجر پن کے ذمہ دار عناصر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دنیا کو کُشتی کا اکھاڑہ قرار دیتے ہیں، جہاں ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے اور مختلف قوتیں اپنے مفادات کے لیے سرگرم ہیں۔

جسے کہتے ہیں سب دنیا یہ کُشتی کا اکھاڑہ ہے
نہ محکم اس میں ہو پاوے گی قوت بائیں بازو کی (۷)

داؤد رہبر نے قافیہ اور ردیف کے حوالے سے بہت سے تجربے کیے۔ ان کی غزل میں ردیف کے الفاظ فعل بھی ہیں جیسے: ہے، آیا، کریں، گئی، کرو، ہیں، رکھا وغیرہ اور حروف اور اسم بھی، جیسے: آدمی، سے، پر، نہیں، زیادہ، تُو، دماغ، نہیں، اللہ، ملتوی، بہتر، ہم نشیں، قرطاس، میرے، کیا، سمجھا، وغیرہ۔ ردیف غزل کی موسیقیت، ترنم، اور موزونیت میں اضافہ کرتی ہے۔ رواں دواں اور مترنم ردیف افعال سے تشکیل پاتی ہے اور افعال بہت محدود ہیں اور ان کی شکلوں میں اضافہ کرنا ایک دِقت طلب بات ہے۔ داؤد کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ وہ منفرد ردیفوں کا چناؤ کرتے ہیں۔

لگائے باغ کیوں رہبؔر بھلا بنجر زمینوں میں
ردیف اس نے اچھی چُنی تو پھر غزل اس نے کہی اچھی

(کلیات، ص:۳۸۸)

غزل کا شعر قافیہ ردیف کی قیود سے متاثر ہوتا ہے۔ شاعر کو بعض اوقات صرف اس لیے مضمون چھوڑنا پڑتا ہے کیوں کہ موجودہ قوافی میں اس مضمون کو ادا نہیں کیا جا سکتا۔ قافیہ کا غلط استعمال شعر کو ہزلیات کی حدود تک لے جاتا ہے۔ جس سے پورے شعر کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ داؤد نے بھی ہر طرح کے قافیہ کا غزل کے شعر میں استعمال کیا۔ ان کے یہاں لفظ کے استعمال کا خاص قرینہ یا سلیقہ نہیں ملتا اور کبھی کبھی وہ الفاظ کو ترکیبی عمل سے گزار کر شعر کی صورت میں ڈھال دیتے ہیں۔ شاعری خیال اور معنی کا حسین امتزاج ہے۔ ایک شاعر کا فنّی کمال یہ ہے کہ وہ موزوں الفاظ کی دروبست، ترتیب اور مناسب بحروں کا خیال معنی کے اعتبار سے رکھے۔ داؤد کی غزل کا بڑا عیب یہ ہے کہ وہ قافیہ پیمائی کی کوشش میں خیال کو مناسب الفاظ میں پیش نہ کر سکے۔ غزل اپنی ساخت کے اعتبار سے مترنم اور بزم آرا ہے۔ لیکن داؤد رہبر کی غزل میں بعض اوقات ہمیں وہ نغمہ اور چُھپا ہوا آہنگ نہیں ملتا جس سے ان کی غزل عمومیت کا شکار ہو گئی۔ محاسنِ شعر کی طرف داؤد کی توجہ ذرا کم رہی۔ ان کے تجربوں میں اشعار اس قدر تمسخر آمیز ہو گئے کہ ان کا شمار سنجیدہ غزل میں نہیں ہو سکتا۔ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ غزل میں ایسے قافیے لاتے ہیں جن کا گمان بھی نہیں ہوتا کہ شاعر اس زمین میں انھیں استعمال کر سکتا ہے۔

جان کی مجھے تم سے گر امان مل جائے
اپنے دل کی کہنے کو پھر زباں مل جائے
گر کہیں مربّی اک مہرباں مل جائے
مجھ کو پھر مُربّے کا مرتباں مل جائے
اور کچھ بھی ہم پیارے مانگتے نہیں تم سے
دستِ ناز سے ہم کو ایک پان مل جائے

(کلیات، ص:۳۸۵)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو داؤد نے اردو غزل میں مذہبی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی رنگ سمیٹ کر اسے تنوع اور بُوقلمونی عطا کی۔ انھوں نے نرم اور صوتی آہنگ کے بے شمار الفاظ اردو غزل میں شامل کیے۔ یہ الفاظ نہ صرف ان کے خیال، جذبے اور کیفیت کے اظہار کا ذریعہ بنے بلکہ اردو لغت میں اضافے کا باعث بھی بنے۔ اردو غزل میں انوکھی تراکیب کا استعمال ان کے وسیع مطالعے پر دلالت کرتا ہے۔ ان تراکیب میں نیا پن اور اچھوتا پن موجود ہے۔ لیکن وہ شعر میں ایسے الفاظ کا انتخاب کرنے میں ناکام رہے جس سے روانی اور تازگی پیدا ہو اور شعر کی بندش چست ہو۔ بسا اوقات ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے الفاظ کی نشست و برخاست پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ جس کی وجہ سے ان کے اشعار میں ڈھیلا پن اور جھول نمایاں ہوتا ہے۔ وہ قافیہ اور ردیف کے معاملے میں کسی قدر تجاوز اور انحراف کا شکار ہو گئے۔ کہیں کہیں ان کے شعر بالکل سپاٹ ہو جاتے ہیں۔ ان کے لہجہ میں روانی اور آہنگ کی کمی ہے۔

داؤد رہبر نے مشقِ سخن تو خوب کی لیکن اس بسیار نویسی کے باوجود ان کی غزل ان کی نثر کے معیار کو نہ پہنچ سکی۔ بہرحال اردو غزل کی جدید تر روایت میں داؤد کی غزل ایک ایسا اضافہ ہے جو ان کی اپنے ماضی سے وابستگی کا

ذریعہ ہے۔ہمیں ان کی شاعری میں ایک ایسے فن کار کا سراغ ملتا ہے جو آزادیٔ اظہار پر یقین رکھتا ہے۔ داؤد رہبر کی شاعری کے بارے میں مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب کی شاعری ان روایتی معنوں میں شاعری نہیں ہے۔ جس سے ہمارے عام شاعروں کے دیوان گراں بار ہوتے ہیں۔ یہ اپنے تہذیبی و ثقافتی ماضی سے وابستگی کا ایک وسیلہ ہے، جو کچھ ہے وہ اس سے مطمئن نہیں ہیں اور جو کچھ نہیں ہے، اسے ان کی نظریں تلاش کرتی رہتی ہیں خصوصاً بچھڑے ہوئے لوگوں کو جو ہزاروں میل دُور بیٹھے ہیں۔'' (۸)

حواشی و حوالہ جات:

(۱) رشید احمد صدیقی، جدید اردو غزل، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمان، (لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۸۷ء)، ص:۲۳

(۲) داؤد رہبر، کلیات، (کراچی: پاکستان پرنٹرز، ۲۰۰۱ء)، ص:۵

(۳) یہ شعر داؤد رہبر کی جس غیر مطبوعہ غزل سے لیا گیا، وہ داؤد صاحب نے مورخہ ۳۰ مارچ ۲۰۰۷ کو ڈاکٹر نعمان الحق کے نام ایک خط میں تحریر کی۔

(۴) یہ شعر داؤد رہبر کی جس غیر مطبوعہ غزل سے لیا گیا، وہ داؤد صاحب نے فروری ۲۰۰۶ میں ڈاکٹر نعمان الحق کے نام ایک خط میں تحریر کی۔

(۵) حالی، الطاف حسین: مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، (علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۶ء)، ص:۱۸۵

(۶) ممتاز الحق، ڈاکٹر، اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۹ء)، ص:۲۵

(۷) یہ شعر داؤد رہبر کی جس غیر مطبوعہ غزل سے لیا گیا، وہ داؤد صاحب نے مورخہ ۳۰ مارچ ۲۰۰۷ کو ڈاکٹر نعمان الحق کے نام ایک خط میں تحریر کی۔

(۸) مشفق خواجہ، مزید خامہ بگوشیاں، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء)، ص:۲۱۸

مآخذ:

(۱) حالی، الطاف حسین: مقدمہ شعر و شاعری، (مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی)، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۶ء۔

(۲) داؤد رہبر، کلیات، کراچی: پاکستان پرنٹرز، کراچی، ۲۰۰۱ء۔

(۳) رشید احمد صدیقی، جدید اردو غزل، مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمان، لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۸۷ء۔

(۴) مشفق خواجہ، مزید خامہ بگوشیاں، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء۔

(۵) مکاتیب بنام ڈاکٹر نعمان الحق

(۶) ممتاز الحق، ڈاکٹر، اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۹ء۔